ادھر سے شیر آنکلا، نئے نئے ہل کو کونے میں رکھ کر وہ اس کی طرف آیا اور بولا۔ ''میں نے ہر دکان سے لوہے کے کو کے پوچھے، مگر کہیں نہیں ملے۔ ارادہ تھا کہ تمہارے ہل کی ستھی پر کو کے لگا کے اسے بالکل نقرئی بنا دیتا جو دھوپ میں چمکتے تو جاگیردار کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔''

''یہ میرا ہل ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، یہ تمہارا ہی ہل ہے۔'' اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور جاگیردار کے مزارعوں نے کہا کہ اگر۔''

''مجھے بہن بتا چکی ہیں۔'' وہ بولا۔

''لسی پی ہے؟'' وہ بولا۔

''پی لوں گا۔''

''لسی پی لو تو چل کر کھیت میں ہل کی بسم اللہ کریں۔''

''ابھی چلتے ہیں۔''

''خوف کی کوئی بات نہیں۔''

''نہیں۔ تم جو میرے ساتھ ہو۔''

''پڑوس سے میں نے تمہارے لئے بیل مانگے ہیں وہ دو دنوں کے لئے لیتا آؤں۔''

''لے آؤ۔''

''حقہ پیو گے؟''

''پی لوں گا۔''

اور شیر نے لپک کر کونے سے حقہ اٹھایا تازہ پانی ڈالا ہاتھوں کو جھاڑ پونچھ کر تمبا کو مسلی اور پھر تمبا کو سلگا کر اور حقہ اس کے پاس رکھ کر صحن سے نکل گیا۔

اور وہ سوچنے لگا کہ اگر حکومت اسے ہرنام سنگھ کے کھیتوں کی بجائے صرف شیرے کی محبت اور شفقت اور رفاقت دے دیتی، جب بھی وہ اس کا ممنون ہوتا۔ یہ سونے کی طرح چمکیلی اور مکھن کی طرح نرم دوستی جس کا ضمیر بہاروں اور ستاروں کے رنگ و نور کا مرکب ہے۔ رہتک سے لیکر واگہہ کی تمام بربادیاں، بے آبروئیاں اور بے دست و پائیاں، جو اس کے دماغ میں گہری خواہشوں کی طرح ایک ابدی کسک کے ساتھ نمایاں تھیں مٹنے لگیں۔ جاگیردار کی کف آلود گالیوں نے ایک جنونی کی بڑ کی صورت اختیار کر لی اور اس نے بانہوں کو تان کر اور ٹانگوں کو پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی اور ایک طویل سانس کے ذریعے اس نے اس کی روح اور جسم سے سارا زہر نکال کر باہر پھینک دیا،

ہلکا پھلکا ہوکر وہ حقے پر جھکا مگر اب تک تمبا کو بجھ چکی تھی۔ مسکرا کر وہ ہل کے پاس گیا۔ اور اس پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے ہل متاثر ہو کر اپنی دم ہلانے لگے گا۔ پلٹا تو دہقان کی بیوی لسی کا گلاس لئے کھڑی تھی۔ وہ پی چکا تو صحن میں دو بیل داخل ہوئے جن کے کھروں کی دھمک سے جیسے صحن چیخ جائے گا۔

''کیسی جوڑی ہے؟'' دہقان نے مسکرا کر پوچھا۔

''طوفان ہے۔''

''میں چاہتا ہوں ذرا جاگیردار کو پتہ چلے کہ تم اکیلے نہیں ہو۔''

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر فرط مسرت سے اس کی آواز گھٹ گئی اور جواء اٹھا کر بیلوں کی طرف بڑھا، ادھر چھپر کے تلے سے دہقان اپنی جوڑی نکال لایا۔ طرفین زور زور سے ڈکرائے اور صحن میں بچوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ ہل کاندھوں پر رکھے مشرق و مغرب کے یہ وہ دہقان بیل لئے گلی میں آئے اور جب چوپال کے قریب سے گزرے تو کہ جاگیردار نائب تحصیلدار کی آچانک آمد پر مرغے ذبح کرا رہا تھا۔ اس نے خون آلود آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ اور پھر مرغوں کو ذبح کرتے ہوئے موچی کو ماں کی گالی دے کر بولا۔ ''ابے چھری چلا اور قصہ پاک کر چھری اٹھا کر یوں کلام پڑھنے لگتا ہے جیسے قرآن مجید ختم کر کے دم لے گا ماں کا۔۔''

اور ایک لمبا تڑپتا ہوا نیم بسمل مرغا چوپال پر سے اچھل کر نیچے گلی میں خون اور خاک اڑانے لگا۔

ہرنام سنگھ کے کھیت ہتھیلی کی طرح صاف تھے، آن کی آن میں دونوں کھیتوں کو الٹ پلٹ کر دھر دیا۔ نئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو کر جیسے جھومنے لگی اور جب سائے مشرق کی طرف رینگے تو دہقان کی بیوی کھانا لے کر آ گئی۔ گندم اور باجرے کی روٹیاں، مکھن اور لسی، اچار اور بیر!''

اور جب وہ فاتحانہ شان سے گاؤں کو پلٹے تو راستے میں انہیں چوکیدار ملا۔۔۔ نائب تحصیلدار نے اسے چوپال پر بلایا تھا۔۔۔ دونوں نے چوپال کا رخ کیا۔ اور ہانپتے ہوئے بیلوں کو بھری چوپال کے سامنے روک کر اس نے نائب تحصیلدار کو سلام کیا اور ایک رجسٹر پر انگوٹھا لگا کر جاگیردار پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر وہ چوپال سے اتر آیا اور دونوں بیل ہانکتے گلی میں مڑ گئے اور حیرت زدہ دہقان دیر تک ان کے بارے میں سرگوشیاں کرتے رہے اور جاگیردار دیر تک جی ہی جی میں اپنے ابا کو کوستا رہا۔ جس نے لہر میں آ کر زمین ہرنام سنگھ کے حوالے کر دی۔ ''مگر خیر دیکھا جائے گا۔'' مونچھوں کی نوکیں مروڑتے ہوئے اس کے انداز پکار پکار کر کہتے۔

اور ادھر ہرنام سنگھ کے کھیتوں میں چند دنوں کے بعد باجرے اور جوار کے ذرا ذرا سے پودے جھانکنے لگے۔ ہر طرف مخمل سی بچھ گئی۔ لوگ بھیڑوں اور بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کو ان کھیتوں سے بچا کر لے جاتے اور کہتے۔ ''مہاجرین کی فصل سے ایک تنکا تک حرام ہے تم پر۔'' کبھی کبھی جاگیرداران پہاڑوں پر تیتروں کا شکار کھیلنے آتا جن کے قدموں میں اس کے کھلے کھیتوں سے ملحق ہرنام سنگھ کے کھیت

پھیلے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک اپنی ایک مونچھ کا سرا دانتوں میں دبائے سوچتا رہا اور پھر ہوا میں فائر کر کے زور زور سے ہنستا ہوا اپنے ساتھیوں کی پیٹھیں ٹھونکتا ہوا پرلی طرف اتر جاتا۔

ایک روز وہ تڑکے کے اپنے کھیتوں میں آیا تو بہت سی بھینسیں اور گائیں فصل کے نئے نئے خوشوں پر دعوت اڑا رہی تھیں۔ وحشت زدہ ہو کر وہ ان پر پل پڑا اور انہیں بھگاتا ہوا بڑے راستے پر لے آیا۔ جہاں شیرا اپنے کھیتوں کی مینڈوں پر سے گھاس کاٹ رہا تھا۔

''تمہارے کھیت میں تھیں یہ سب کی سب؟'' اس نے درانتی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس کی آواز میں فریاد تھی۔ ''جہاں جہاں منہ مارا ہے چٹیل کر کے رکھ دیا ہے کھیت کو۔''

''تو انہیں کہاں لئے جا رہے ہو؟''

''کہیں نہیں۔ یہیں بڑے راستے پر چھوڑ دوں گا۔''

''تھانے کیوں نہیں لے جاتے؟''

''تھانے؟''

''ہاں ہاں۔ ان کو کانجی ہاؤس میں بند کرآؤ۔''

''کس کی ہیں یہ؟''

''جاگیردار کی۔''

''جاگیردار کی؟'' تھانے کا راستہ بتاؤ۔''

''دونوں چلتے ہیں۔''

اور وہ بھینسوں اور گایوں کو ہنکاتے دو تین میل دور قصبے میں آئے اور انہیں کانجی ہاؤس میں بند کر دیا۔

علاقے بھر میں ایک ہلڑ سا مچ گیا، اتنے بڑے جاگیردار کے مویشی اور کانجی ہاؤس میں! جیسے جیل خانے صرف غریبوں کے لئے اور کانجی ہاؤس صرف غریبوں کے مویشیوں ہی کے لئے تو بنے ہیں۔۔۔ اور جب وہ دونوں گاؤں پہنچے اور جاگیردار کے مویشیوں کی خبر سنی تو جاگیردار کے مزارعے بھاگے بھاگے آئے۔ اور ان کو مبارک بادیں دیں اور کہا۔ ''کیوں بھئی، جاگیردار کی زمینیں کیا آسمان سے اتری ہیں اور ہمارے تمہارے کھیت چورا ہے ہیں کیا۔ کہ جو بھینس گائے بھٹکے یہیں آ کر دم لے، ایسا سبق پڑھایا ہے تم نے جاگیردار کو کہ اپنے بیٹے کو بھی نصیحت کر جائے گا، ہاتھ ملاؤ۔''

سارا گاؤں حیران تھا کہ آخر جاگیردار نے ایسی زبردست ہتک پر چپ کیوں سادھ لی ہے۔ یہ وہی جاگیردار تو ہے جس نے الیکشن کے زمانے میں خضر حیات کی آمد پر جب سارے گاؤں کو ایک سنہری دروازہ کھڑا کرنے کو کہا تھا۔ اور چند نوجوانوں نے انکار کر دیا تھا تو

اس نے انہیں فوراً تھانے بھیج دیا اور تھانیدار کو کہلا بھیجا کہ ان پر کوئی سا مقدمہ چلا دو۔ یہ کم بخت پاکستان کے حق میں ہیں۔ اور پھر جب اس کے بیٹے کی شادی پر ایک غریب گڈریے کا پرنالہ کجاوے کے ساتھ الجھا چلا آیا تھا۔ اور گڈریے نے نیا پرنالہ مانگا تھا تو دوسرے روز صبح کو گڈریے کی ساری بھیڑیں باڑے میں ڈھیر پڑی تھیں۔ یہی جاگیردار اب ایک منحنی سے مہاجر سے کیسے دب گیا؟

''کوئی طوفان آنے والا ہے؟'' شیرا مہاجر سے کہتا۔

اور وہ بے پروائی سے ہنس کر جواب دیتا۔ ''ہم نے لہو کے سیلاب میں کشتیاں چلائی ہیں بھئی، ہم اس جاگیردار کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے اور اب سب جاگیریں ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں۔''

''ہم لوگوں میں بٹ جانے والی ہیں جاگیریں؟'' شیرا حیران ہو کر کہتا۔ اور تعجب اور مسرت کے سیلابی جذبات سے وہ گھگھیانے لگتا۔ ''یعنی۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ۔۔۔۔۔جاگیردار کی جاگیر۔۔۔۔۔جاگیردار کی جاگیر نہیں رہے گی؟''

''آثار تو ایسے ہی ہیں۔'' وہ کہتا۔ ''اور شائد یہی وہ طوفان ہے جو آنے والا ہے۔''

''بھئی ایسے طوفان کے صدقے جاؤں۔'' دہقان حقے کا بھرپور کش لگا کر کہتا اور بیل ڈاکرا کر اس کا ساتھ دیتا۔

ساون کے ابتدائی دنوں میں معمولی بارش سے دہقان اس قابل ہوئے تھے کہ جوار باجرہ بو سکیں۔ اس کے بعد آسمان چٹیل سا ہو کر رہ گیا تھا، سارا ساون بادلوں کی راہ تکتے گذر گیا۔ مغربی پربت پر سے کوئی بدلی اٹھتی بھی تو چوٹی سے چمٹ کر رہ جاتی، صبح کو وہ چوٹی سے اتر کر نشیب کا رخ کرتی۔ اور پربت کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل میں ڈوب کر کھو جاتی۔ منتیں مانی گئیں، مزاروں پر چراغ جلائے گئے۔ اور قبرستان کے درختوں کی ٹہنیاں سرخ اور سبز دھجیوں سے پٹ گئیں، پیر جی نے ہوا کے رخ پر ایک شاداب درخت سے تعویذ بھی لٹکایا اور کنکروں پر دم کر کے انہیں کنوؤں میں بھی پھینکا مگر بادل عنقا ہی رہے۔ فصلوں میں بچھی ہوئی مخمل پر گرد سی جمنے لگی اور کونپلوں کی نوکیں سنہری ہونے لگیں۔ اور اب بھادوں کی آخری تاریخیں تھیں۔ شیرا اپنے صحن کے سرے پر بیٹھا بچوں میں گھنگھنیاں بانٹ رہا تھا اور مہاجر تسبیح پر کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ اچانک کہیں دور سے دبی دبی گرج سنائی دی۔ ایک دم سارا گاؤں چونک اٹھا اور گلیوں اور چھتوں پر جمع ہو گیا۔ شیرے کو دوسری طرف متوجہ پا کر بچوں نے گھنگھنیوں کے دیگچے پر ہلہ بول دیا اور مہاجر تسبیح کو پلنگ کے پائے سے لٹکا کر اچک کر دیوار پر کھڑا ہو گیا۔

''بادل اتر سے اٹھا تھا۔'' وہ خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''تو پھر کدال سنبھالو۔'' دہقان بچوں کے جھرمٹ میں سے بگیا کھینچتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے کھیتوں میں تو پہاڑ پر سے اتنا پانی آئے گا کہ باجرہ گل کر ہی نہ رہ جائے۔''۔۔۔۔کہاں ہے بادل؟'' وہ بھی دیوار پر آ گیا۔

دور اتری پہاڑیوں پر ہلکی ہلکی بجلی چمک رہی تھی اور ہوا میں خنکی سی رچ رہی تھی۔

''بادل ادھر ہی آ رہا ہے۔'' شیرا چہکا۔

''نہیں۔'' پڑوس کی چھت پر سے ایک بوڑھا بولا۔ ''وہیں رک گیا ہے۔''

''تیرے منہ میں انگارہ۔'' شیرے نے جل کر کہا۔

''اور تیرے منہ میں مکھانے۔۔۔صرف اگر بادل یہاں تک آجائے۔''

''گواہ رہنا بھائیو۔۔۔شیرے نے چلا کر سارے محلے کو مخاطب کیا۔ ''چچا نے مکھانوں کا وعدہ کیا ہے!''

دور دور سے قہقہوں کی آوازیں آئیں اور جب یہ طوفان رکا تو اچانک بوڑھا ماتھے پر ہاتھ مار کر پکار اٹھا۔ ''ہائے رے نصیب۔ میں تو شرط ہار گیا۔ بادل تو ادھر ہی آرہے ہیں۔'' اور پھر اس نے تہمد کے کونے سے اٹھنی نکال کر شیرے کے منہ پر دے ماری۔

''پھول ہے پھول'' دہقان قہقہے لگاتا تالیاں بجاتا پیٹتا اٹھنی کے لیے نیچے گلی میں کود گیا اور پھر چند لمحوں کے بعد دھوپ غائب ہوگئی درختوں کی ٹہنیاں جاگ اٹھیں، سبزے کا رنگ نکھر آیا اور کہر اتر کر جیسے دالانوں میں ناچنے لگی۔

''کدالیں اٹھاؤ۔'' شیرا چلایا۔ ''پوربی کونے میں رکھی ہیں۔''

وہ اندر گیا اور کدالیں اٹھالایا، پاجامہ گھٹنوں تک چڑھالیا اور آستینیں اڑس لیں اوپر سے بادل دھاڑ کر پھٹا اور جلی ہوئی مٹی کی خوشبو کے طوفان اچھال دیئے۔ ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں بھاگنے لگے۔ باڑوں میں بھیڑیں بکریاں ممیا اٹھیں ہر گھر میں اٹھا پٹخ شروع ہوگئی اور دہقان کدالیں سنبھالے بھاگتے ہوئے اور ہنستے ہوئے اور چھینٹے اڑاتے ہوئے ایک دوسرے کے پاس سے گذرنے لگے۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے بڑے راستے پر آئے، شیرے نے اپنے کھیت کا رخ کیا اور وہ اپنے کھیت کی طرف لپکا موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ چند قدم آگے بڑھا تو شیرے کو گنجان بوندوں نے چھپالیا۔ گرج اور چمک اور چھاجوں پانی۔ پگڈنڈیاں ندیاں بن گئی تھیں اور ندیاں اینڈ اینڈ کر دوڑتی پھرتی تھیں۔ اور وہ کدال سنبھالے بھاگتا گیا۔ سب کھیت تالابوں میں بدل چکے تھے۔ صرف مینڈوں کے حاشیے نمایاں تھے۔ مینڈوں پر ہوتا ہوا جب وہ اپنے کھیت کی مینڈ پر پہنچا تو اچانک دم بخود ہو کر رک گیا اور کدال اس کے ڈھیلے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ اس کے کھیت میں جگہ جگہ پانی رینگ رہا تھا مگر وہ تالاب والی کیفیت نہیں تھی۔ ''میرے حصے کا پانی کہاں جارہا ہے؟'' اس کی حیران آنکھوں نے پہلے تو جھکی ہوئی گھٹا سے اور پھر ملحقہ پہاڑ سے اور پھر خود کھیتوں سے پوچھا اور کچھ دیر تک بت کی طرح کھڑا رہ کر اس نے کدال اٹھا کر کندھے پر دھرلی۔ ''آخر میرے کھیتوں کا پانی کہاں غرق ہو رہا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پہاڑ کی طرف بڑھا چوٹی پر جا کر اس نے دیکھا کہ اتری افق پر بادل چھٹ رہا تھا۔ دیوانہ وار اس نے نیچے نظریں دوڑائیں سارے پہاڑ کا پانی ایک مصنوعی نالی کے کنارے کنارے نشیب کی طرف بھاگا۔ اور جب رکا تو جاگیردار کے وسیع کھیتوں کے کنارے کھڑا تھا۔ اور سارے پہاڑ کا پانی جاگیردار کے کھیت نگلے جارہے تھے۔ پہلی بار اس کے منہ سے جاگیردار کے لیے گالی نکلی۔ اور پھر کچھ اس تیزی سے کدال چلائی کہ آن کی آن میں پہاڑی پانی کے آدھے حصے نے اس کے کھیتوں کا رخ اختیار کر لیا۔

ایک گرجدار قہقہہ لگا کر اس نے کدال ایک طرف پھینک دی۔ اور اچک کر ایک چٹان پر جا بیٹھا بارش تھمنے لگی تھی مگر پہاڑی پانی کی شدت بدستور جاری تھی۔ جلد ہی اس کے کھیتوں کا نصف حصہ سیراب ہو گیا اور ابھی پانی بڑھ رہا تھا اور مصنوعی نالیاں بج رہی تھیں۔

بارش تھم گئی کہیں کہیں دھوپ کے دھبے بھی نمایاں ہونے لگے تھے مگر پہاڑی نالیاں بارش کے بعد ہی تو لہر میں آتی ہیں وہ بدستور گرج رہی تھیں اور اسی چٹان پر بیٹھا سامنے پہاڑی پر بکھرے ہوئے گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے خاکستری گھروندے دھل جانے کے بعد اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے اور مانوس سے بھی۔ اور پھر وہ دور مغربی پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی میں پیوست سنہری سورج کی طرف دیکھ کر مسکرایا دہقان کاندھوں پر کدالیں رکھے پگڈنڈیوں پر سے ہوتے ہوئے بڑے راستے کی طرف آ رہے تھے اور گاؤں کے تنوروں میں سے دھوئیں کے بہت سے مینار بلند ہو رہے تھے۔ زندگی میں دوسری بار اسے ایک عجیب خیال سا آیا کاش ان میناروں میں سیڑھیاں ہوتیں اور وہ لپک کر ایک مینار کی چوٹی پر جا نکلتا اور دھوئیں کے پردے سرکا کر شریر بچوں کی سی سیٹیاں بجاتا اور تالیاں پیٹتا اور چلاتا۔ ''میں وہی ہوں جاگیردار جی جس کو آپ نے چوپال پر سے دھتکار دیا تھا۔ وہی آج اس دودھیا مینار کی بلندی پر سے آپ کو پکار رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ مزاج تو اچھے ہیں آپ کے!''

اور اس نے فاتحانہ قہقہہ لگا کر کئی ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ سے اترتے ہوئے جاگیردار سے پوچھا۔ ''کہیے مزاج تو اچھے ہیں آپ کے!''

جاگیردار کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ کدال اٹھانے کے لئے چٹان پر سے کودا۔ مگر جاگیردار کے ساتھیوں نے اسے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا اور جاگیردار نے بڑھ کر اس کی ماں کی یاد کر کے اس کی پسلیوں میں دو تین گھونسے جما دیئے۔ وہ بل کھا کر گرا تو اس کے پیٹ پر زور سے ٹھوکر لگائی اور پھر ایک من چلے نے اس کی ناک پر پتھر کھینچ مارا۔ وحشیوں کی طرح اس نے ادھڑے ہوئے گالوں اور پھٹی ہوئی ناک کو اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے نوچ ڈالا اور پھر اس کا خون آلود ہاتھ ڈھیلا پڑ کر ایک پتھر پر جا گرا اور چڑیوں کا ایک غول فضا میں سے اتر کر اس کے سر پر ایک سنسناتی قوس بناتا اوپر ابھر گیا۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو صاف آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے تھے۔ اور ہر طرف مینڈکوں نے شور محشر بپا کر رکھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک چپ چاپ لیٹا چاند اور ستاروں کو دیکھتا رہا اور مینڈکوں کا شور سنتا رہا اور پھر اچانک ہڑبڑا کر اٹھا۔ مگر تیورا کر بیٹھ گیا۔ اور اس کی ناک سے بہتا ہوا خون اس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر سے ہوتا اس کی قمیص میں جذب ہوتا رہا۔ اور لبریز کھیتوں میں چاند نہا رہا تھا۔ اور ستارے ڈبکیاں لگا رہے تھے اور ہوا جیسے نمناک ریشمی چادریں فضا میں لہراتی پھرتی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی کدال غائب تھی۔ لپک کر وہ پہاڑی نالی کے پاس آیا۔ تھوڑا تھوڑا پانی اب بھی جاگیردار کے کھیتوں کی طرف بہا جا رہا تھا۔ کنکروں کا ایک ڈھیر لگا کر اس نے پانی کی دھار کا رخ بدل دیا۔

''ادھر آؤ۔'' وہ زخمی انگلیوں سے پتھریلی زمین کو کریدتا ہوا چمکتی ہوئی دھار کو ہلانے لگا۔

''اس طرف آؤ۔ان کھیتوں میں کسانوں کی لاشیں اگتی ہیں ادھران کھیتوں میں آؤ۔جن کے بوتے پر کسان زندہ ہے۔انسان زندہ ہے۔پاکستان زندہ ہے۔ادھرآؤ۔'' وہ ناک سے ٹپکتے ہوئے لہوکو آستین سے پونچھا اور انگلیوں کی پوروں سے رستے ہوئے خون کو پتھروں پر ملتا چلا گیا۔''ادھر میرے کھیت میں آؤ۔اورنورے کے کھیت میں اور بیگ کے کھیت میں اورنواز کے کھیت میں اور شیرے کے کھیت میں اور۔۔۔۔۔۔۔۔''

اور دور چاندی سے دھلی ہوئی پہاڑی پر سے شیرا۔'بھیا۔او بھیا پکارتا ہوا لپکا آ رہا تھا۔

کہانی لکھی جارہی ہے

میں بچے کو جھجھر میں پانی پلانے کے لئے رکا تو وہ میرے پاس آیا، میں سمجھا وہ پیاسا ہے۔اس لئے میں نے خاموشی سے جھجھر اس کی طرف بڑھادی مگر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔''نہیں مجھے پانی نہیں چاہیے۔''

وہ پگڈنڈی پر بہت آگے جارہا تھا اور پلٹ کر میرے پاس آیا تھا اس لئے میں نے سوچا اسے مجھ سے کچھ نہ کچھ تو ضرور چاہیے۔''کیا چاہیے تمہیں؟ میں نے بچے کو پانی پلاتے ہوئے پوچھا۔

''کہانیاں۔'' وہ بولا۔

اور گاؤں چھوڑنے کے بعد شائد پہلی بار ہم سب مسکرائے فاطمہ تو ہنسنے لگی، اسے مسکرانا آتا ہی نہیں، وہ ہمیشہ ہنستی ہے اور کے بھی وہ ہنس دی، اتنی بھاری گٹھری اور دکھتے پاؤں کے باوجود ہنس دی، اور فاطمہ کی طرف دیکھ کر وہ بولا۔''مجھے کہانی مل گئی۔''

فاطمہ اور زور سے ہنسنے لگی، بچے نے خواہ مخواہ اپنی ماں کی ہنسی میں شامل ہونا چاہا تو منہ کا پانی ناک میں آگیا، ہنسی اور کھانسی کے بین بین اس نے عجیب عجیب آوازیں لگالیں تو مسافر نے اسے اٹھالیا اور اس کے ننگے پاؤں پر جمی ہوئی دھول کو اپنے ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے بولا۔''تم کہاں جاؤ گے؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ مجھے کہیں نہیں جانا تھا اور ہر جگہ جانا تھا۔میرے سفر کی کوئی سمت مقرر نہیں تھی میں بگولے میں پھنسا ہوا ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، میں اپنے گاؤں سے نکل آیا تھا کیونکہ میں نے ایک روایت سے بغاوت کی تھی، اب میں وہ کہانیوں والا گاؤں ڈھونڈنے چلا تھا جہاں کے کھیتوں میں گیہوں کی بالیں موتیوں سے بھری رہتی ہیں اور کنوایاں کھلیانوں پر بیٹھ کر اور درختوں میں چھپ کر الغوزے بجاتی ہیں اور منہ زور گھوڑوں پر سوار ہو کر زمیندار زادے ان موتیوں کے لوٹنے اور ان الغوزوں کو توڑنے نہیں آسکتے ہیں۔وہاں زمیندار ہوتے ہی نہیں، وہاں خوبصورتی ہوتی ہے اور امن اور خوشحالی اور فاطمہ کے قہقہے اور بچے تتلیاں۔۔۔۔وہاں زندگی کے حسن کے دبدبے سے موت کو تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔

مگر اس میں سوئی ہوئی آنکھوں والے مسافر کو یہ سب کچھ کیسے بتاتا، میں نے کچھ دیر تک اس کے سوال کا جواب سوچا اور جب کچھ نہ سوچ سکا تو فاطمہ کی طرف دیکھا اور فاطمہ نے میری طرف دیکھا، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ہمیں کہاں جانا ہے، بچہ مسافر کے کندھے پر سوار ہو چکا تھا، اس نے ایک مٹھی میں مسافر کے بالوں کو جکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی قمیص کا کالر مروڑ لیا تھا اور مسافر نے توازن قایم رکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے بچے کا گرد آلود پاؤں تھام لیا تھا اور دوسرے سے اس کی پیٹھ کر تھپتھپا کر اپنا

سوال دہرا رہا تھا۔ ''بھئی کہاں جاؤ گے تم لوگ؟''

اس مسافر کو آخر ہم سے کیا لینا تھا۔ یہ کون تھا جو بہت آگے جاتے ہوئے پلٹ کر ہمارے پاس آیا تھا۔ فاطمہ اس کے کندھے پر سے بچے کو اتارنے کے لئے بڑھی تو وہ بولا۔ ''مجھے کچھ دیر تک تمہارے ساتھ چلنا ہے اور بچہ تھک گیا تھا اس کے تلوے جل رہے ہیں، میں جھیل کے کنارے ان درختوں تک تمہارے ساتھ چلوں گا، مجھے تمہاری کہانی لکھنا ہے۔''

جھیل جسے نوجوان سورج نے ایک بیضوی سی پتری بنا کر دھندلے بھورے پہاڑ کے دامن میں ٹانک دیا تھا ابھی بہت دور تھی اور درخت تو اس سے بھی دور تھے۔ کیونکہ وہ پرلے کنارے پر تھے اور یہاں سے دھوئیں کی ایک کترن معلوم ہو رہے تھے اور اگرچہ پگڈنڈی ہموار وادی میں سے گذرتی تھی اور آس پاس دور دور تک سبزہ اگ رہا تھا۔ جس پر ہلکے اودے رنگ کے کبوتر چہل قدمی کر رہے تھے اور مولے ہوا سے اتر کر ان پر لمبی لمبی دوڑیں لگا رہے تھے اور بھیڑیں اون کے ڈھیروں کی طرح جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھیں اور رنگ رنگ کی تتلیاں جا بجا پروں کے پنکھیاں چلا رہی تھیں۔ مگر دھوپ بہت تیز تھی اور سفر لمبا تھا اور پھر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر اس پگڈنڈی میں سے کوئی دوسری پگڈنڈی نکل آئی تو ہم اس پر نہیں چل دیں گے۔ ہماری منزل جھیل کے کناروں پر درختوں کے چھتنارے نہیں تھے۔ ہمیں تو اس گاؤں میں جانا تھا جہاں سنا ہے کہ گیہوں کی بالیاں، موتیوں سے لدی رہتی ہیں اور جہاں زندگی مسکرائے تو موت کو تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔

ہم پگڈنڈی پر چپ چاپ چلنے لگے اور میں سوچنے لگا کہ کہانیاں تو بادشاہوں اور وزیروں اور امیروں کے بارے میں لکھی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں شہزادیاں چرواہوں کی تلاش میں نکلتی ہیں اور چرواہیوں پر شاہزادے فدا ہو جاتے ہیں اور زندگی طوطے کے پیٹ اور سانپ کے پھن میں مقید رہتی ہے۔ یہ کیسا کہانیاں لکھنے والا ہے کہ حیران حیران پگڈنڈی پر چلنے والے لٹے ہوئے کسانوں سے کہانیاں لینے آیا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ بچے سے باتیں کر رہا تھا اور بچہ مارے جھجک کے گلابی ہوا جا رہا تھا۔ مسافر کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں اس جادوگر کی کہانی سناؤں گا جس نے آسمان کو تاروں سمیت لپیٹ کر اپنی بقچی میں رکھ لیا تھا۔ اور جب بقچی میں بے چارے فرشتے کلبلاتے تھے تو وہ چیخ چیخ کر ہنستا تھا اور کہتا تھا۔ ''ایک روٹی کا سوال ہے۔ ایک روٹی ہر روز لا دو تو ابھی آسمان کا شامیانہ تانے دیتا ہوں۔''

اب بچہ مارے خوشی کے گلابی ہو رہا تھا۔

میں نے ایک بار فاطمہ سے پوچھا تھا کہ آخر یہ لڑکا سوکھی روٹی اور پتلی چھاچھ پینے کے باوجود اتنا موٹا اور گلابی کیوں ہے اور فاطمہ نے بتایا تھا کہ معصوم بچے فرشتے ہوتے ہیں اور ان فرشتوں پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اور پھر جب میں نے اسے قادر کے بچے کا حال بتایا تھا جو خیراتی ہسپتال میں مر گیا تھا اور جس کی جلد تک گل کر گرنے لگی تھی تو فاطمہ نے لپک کر اپنے بچے کو اٹھا لیا تھا۔ اس کے گالوں سے اپنے گال یوں ملا لئے تھے جیسے اپنی جوانی کا سارا رنگ وہ اپنے بچے کے مساموں میں اتار رہی ہے۔۔۔۔ اور اب بچہ صرف جھجکتے، شرماتے، حیران ہوتے اور مسکراتے ہوئے گلابی ہو گیا تھا اور اب میں سوچتا تھا کہ شائد کسی وقت حیرت اور مسرت کا یہ گلاب بھی مرجھا جائے اور بچہ اس

پگڈنڈی کے کنارے صرف دم توڑتے وقت ہی گلابی ہو سکے اور پھر سرسوں کے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ہوا میں اڑ جائے۔

''مرتے وقت تو سب رنگ اڑ جاتے ہیں۔'' فاطمہ نے کہا تھا اور پھر چونک کر مجھے یوں ڈانٹا تھا جیسے اس نے بچے کو دودھ کی جگہ آب حیات پلا رکھا ہے اور وہ ان فاقوں اور لمبی مسافتوں اور موسم کی زیادتیوں کے باوجود زندہ رہے گا اور گلابی رہے گا۔

کچھ باتیں کرنے کے لئے میں تیزی سے چل کر مسافر کے برابر آ گیا تو جھجھر میں پانی چھلک اٹھا اور مسافر رک کر بولا۔۔۔''بھئی مجھے بھی پانی پی لینا چاہیے، جھیل تو دور ہی دور ہٹی جا رہی ہے۔''

فاطمہ حسب معمول زور سے ہنسی اور مسافر نے بچے کو کندھے پر سے اتار کر پانی پینے کے لئے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنایا اور جب میں نے جھجھر کے دہانے پر سے گیلے چیتھڑے کا ڈھکنا اٹھایا تو فاطمہ بولی۔''کیوں نہ ان سامنے کی بکائنوں تلے۔''دوپرا'' کر لیں ۔بھوک بھی لگی ہے اور ادھر کہیں سے کوئیں کی روں روں بھی سنائی دے رہی ہے۔جھجھر بھی بھر لائیں گے۔''

مسافر نے ہاتھوں کا پیالہ توڑ دیا اور بولا۔''سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو بہتے چشمے اور چلتے کنوؤں کا پانی پینے میں لطف آتا ہے۔میں جھجھر بھی بھر لاؤں۔اور۔۔۔۔۔۔۔''

''اور تھوڑی سے آگ بھی مانگتے لانا۔'' فاطمہ نے بکائنوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی۔''اسے چائے پینے کی لت ہے۔''

مسافر کے چہرے پر کچھ ایسا رنگ آ گیا جیسے اسے ایک اور کہانی مل گئی ہے۔ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے میرے ہاتھوں سے جھجھر لے لی اور روں روں کی آواز معین کر کے ایک طرف جانے لگا۔بچہ اس کے پیچھے بھاگا۔فاطمہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اب مسافر کے کندھے پر سوار ہو چکا تھا اور مسکرا مسکرا کر ہمیں دیکھتا جاتا تھا۔

ہم بکائنوں کے جھنڈ میں آ گئے۔جا بجا بھیڑوں بکریوں کی مینگنیاں پڑی تھیں جو خشک ہو کر بڑا اچھا ایندھن بن گئی تھیں۔ٹھنڈی ہوا بھی گرمی سے گھبرا کر جیسے یہیں۔''دوپرا کر رہی تھی۔ساری وادی کی چڑیاں بھی یہیں جمع تھیں۔''بس ایک رکاڑوں والے باجے کی کمی ہے۔'' فاطمہ نے گٹھری اتار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔پھر ایک دم زور زور سے ہنستی ہوئی جھکی اور گٹھری میں من چھپا لیا۔

رکاڑوں والا باجا میری چڑ تھی۔وہ یوں کہ شادی سے پہلے میں جاگیرداروں کے باجرے کے یک کھیت میں چوری چھپے گھاس کاٹنے گیا۔باجرے کے پودوں کے ارد گرد گھاس اتنی گنجان اور اونچی تھی کہ میں درانتی چلاتے ہوئے بالکل نشے کی سی حالت میں، ادھر ادھر دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں آگے بڑھتا گیا اور جب میں کھیت کے وسط میں پہنچا تو اچانک گھاس میں ڈوبی ہوئی میری درانتی کو کسی نے جکڑ لیا تھا۔میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو سہمی ہوئی فاطمہ بیٹھی تھی۔اور اس کی درانتی کو میری درانتی نے جکڑ لیا تھا۔وہ بھی چوری چھپے گھاس کاٹ رہی تھی۔وہ بھی ناک کی سیدھ میں، نشے کی سی حالت میں بڑھی چلی آئی تھی، کچھ دیر سہمے رہنے کے بعد ہم دونوں نے ایک

دوسرے کی نیتیں آنکھوں آنکھوں میں پڑھ لیں، میں تو خیر مسکرادیا مگر فاطمہ اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکی اور اگر اس کی پیٹھ پر لٹکی ہوئی چادر کی ''جھولی'' میں گھاس کا انبار نہ ہوتا تو وہ تقیناً ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں پیچھے لڑھک جاتی۔ مارے خوف کے میں نے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ لیکن جب وہ ہنستی چلی گئی، تو میں نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ اور میں نے بھی اپنا ہاتھ فوراً پیچھے ہٹالیا۔ گنجان گھاس میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے۔ اور جب درانتی اس نشے کو بکھیرتی ہے تو اچھے چھوں کو نیند آلیتی ہے۔ شائد اسی لئے میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر فاطمہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور اب اپنے ہاتھ کو یوں پکڑے بیٹھا تھا جیسے پھول کے دھوکے میں انگارا چھولیا ہے۔ بعد میں فاطمہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز اس کی ہنسی اچانک یوں رک گئی تھی جیسے رکارڈ پر سے ''سون بکس'' اٹھالیا جاتا ہے۔۔۔۔ پھر جب ہماری شادی ہوئی تو پہلے ہی روز اس نے رکارڈروں والے باجے کی فرمائش کردی۔ اور جب میں نے فصل اٹھانے کے بعد کا وعدہ کرلیا اور فصل اٹھی۔۔۔ مگر یہ بات تو بہت لمبی ہے۔ کہنا صرف یہ تھا کہ وہ جب بھی مجھے چھیڑنا چاہتی، باجے کا ذکر کر دیتی۔ پہلے تو خیر میں خفا ہونے لگتا تھا، لیکن اب اداس ہوجاتا تھا اور وہ جھینپ جاتی تھی۔ اب کے بھی اس نے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے اس کے ہاتھوں سے کانچ کا پیالہ بے جانے بوجھے گر کر ٹوٹ گیا ہے۔

مجھے فاطمہ پر رحم آگیا۔ میں نے اس کے گال تھپتھپادیئے مگر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس نے پلٹ کر چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا۔ ''فاطمہ تم رورہی ہو اور پھٹے ہوئے چولہے میں سے تمہاری پیٹھ ہنس رہی ہے۔''

وہ بے اختیار ہنس دی، ادھر اس کے گالوں پر آنسو پھیل گئے تھے، ادھر ہنسی سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اور اب میں اداس ہو گیا۔ مجھے فاطمہ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ اپنی کسی نی کسی حرکت سے مجھے گزرے ہوئے زمانے میں لے جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ بالکل ایک ماں کی طرح میرا ماتھا چوم لیتی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ گلی ڈنڈا اٹھا کر باہر میدانوں میں نکل جاؤں اور گلی پر ایسی ایسی زناٹے کی ضربیں لگاؤں کہ گلی ہوا میں سے سیٹی بجاتی ہوئی گذرے۔ پھر اسے ماہے کی بڑی کلیاں یاد تھیں۔۔۔۔۔۔ ''جنگل پھلاہی ہوواں پئی پھٹاں بہاراں نا'' اور مجھے وہ دن یاد آجاتے ہیں جب ''پھلاہیوں'' کے سائے تلے بیٹھ کر میں نے ان کی ننھی ننھی پتیوں کی خوشبوئیں پی ہیں اور دور خراش کے درختوں میں سے گذرتی ہوئی ہواؤں نے مسلسل گیت سنے ہیں اور یوں صبح سے شام کردی ہے۔ انسان یا تو ساری عمر بچہ ہی رہے یا بوڑھا ہی پیدا ہو، کچوکوں سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے۔

مسافر جھجھر بھی بھرلایا اور دو اپلوں پر آگ بھی رکھ لایا۔ وہ بچے کو کندھے پر سے اتار کر فاطمہ کو چولہا بنانے میں مدد دینے لگا تو میں نے اس سے رکارڈوں والے باجے، اور فاطمہ کے رونے اور چولہے میں اس کی جلد کی ہنسی کی ساری باتیں کہہ دیں، اصل میں وہ تھوڑی ہی دیر میں ہم سے کچھ ایسا گھل مل سا گیا تھا، فاطمہ جھینپتی رہی، مسافر ہنستا رہا، اور پھر جب میں نے گذرے ہوئے زمانے کو گالی دی تو وہ دھواں چھوڑتے ہوئے اپلوں کی آگ کو زندہ رکھنے کے لئے اس میں پھونکیں مار رہا تھا۔ اس نے اپلوں کو چولہے، میں رکھ دیا اور بڑا عجیب سا چہرہ

بنا کر، بالکل انگریز روپے والی مورت کی سی صورت بنا کر میرے قریب آیا اور بولا۔ ''گزرے ہوئے زمانے کو گالی نہ دو، گزرا ہوا زمانہ ہم سے کچھ نہیں چھینتا کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے۔''

کوئی شخص یہ بات منبر پر کھڑے ہو کر کہہ دیتا تو مجھے حیرت نہ ہوتی، کیونکہ منبر پر کھڑے ہو کر تو لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اکہتر بار قل ہو اللہ شریف پڑھنے سے انسان سیدھا جنت میں جاتا ہے، اور اگر جنت میں جانا اتنا ہی آسان ہوتا تو دوزخ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ گذرا ہوا زمانہ کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے!۔۔خاک دے جاتا ہے، کچوکے، ٹیسیں، ٹھیسیں،۔۔۔ مجھے درانتی میں درانتی پھنستی محسوس ہوئی، اور پھر بچہ رونے لگا، اسے ایک چیونٹے نے کاٹ لیا تھا، فاطمہ نے لپک کر بچے کے ٹخنے پر سے چیونٹے کو نوچا اس کا دھڑ الگ ہو گیا اور سر وہیں جلد میں گڑا رہ گیا، اور وہ اندھا دھند ہنسنے لگی اور درانتی میں درانتی پھر پھنس گئی!

''کیا دے جاتا ہے گذرا ہوا زمانہ؟'' میں نے مسافر سے پوچھا،

''کچھ نہ کچھ تو دے ہی جاتا ہے۔'' وہ بولا۔ اور زمین پر سے چند خشک پتے اٹھا کر سوکھی ہوئی مینگنیوں سے بھرے ہوئے چولہے میں ڈال دیئے۔ ''ارادہ دے جاتا ہے، اور امید اور امنگ اور عبرت۔''

مجھے وہ پھر منبر پر کھڑا نظر آیا،

''بات یہ ہے'' اس نے بڑے اطمینان سے ادھر اُدھر سے مینگنیاں جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ بیل اور آدمی میں صرف ایک فرق ہے، آدمی سوچ سکتا ہے، بیل نہیں سوچ سکتا۔''

''بیل تو دھڑلے سے سوچتا ہے۔'' فاطمہ نے گٹھڑی میں سے چائے کی پتی نکالتے ہوئے کہا۔ '' ہمارا ایک بیل تھا۔ ہم اسے نقرہ کہتے تھے، جب ہم نقرے کو ہل پر لے جانے لگتے بیٹھ جاتا تھا، اور جب ہم اسے بہت تنگ کرتے تھے اور اس کی دم مروڑتے تھے اور اس کے جسم میں لکڑیاں چبھوتے تھے، تو وہ لیٹ جاتا تھا، نقرہ پہلے سے سوچ لیتا تھا کہ اب بھادوں کی دھوپ میں دن بھر کھیتوں میں بھننا ہوگا، وہ تو اس سے بھی زیادہ سوچتا تھا''۔۔۔۔۔۔

فاطمہ نے میری طرف اشارہ کیا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگی، مسافر بھی خوب خوب ہنسا، بچہ جس نے چیونٹے کا سر نوچ کر زخم پر خود ہی مٹی ڈال لی تھی، مسکراتا ہوا اس کے قریب آ گیا اور میں اداس ہو گیا۔

چٹریاں اڑ گئی تھیں، دھواں جھکی ہوئی ٹہنیوں سے لپٹتا ہوا اوپر گھنے پتوں میں گھس رہا تھا، سیاہ رنگ کے موٹے موٹے چیونٹے جھجھر کے ارد گرد جمع ہو کر قیلولہ کر رہے تھے، ایلومینیم کی بھدی کیتلی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں چائے کی پتیوں کی خوشبو تھی، اور ہوا میں بکائنوں کی خنکی تھی، ایک بھونرا کہیں سے آیا اور دھوئیں سے گھبرا کر زن سے باہر نکل گیا، مسافر کھلی ہوئی گٹھڑی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا،

''سرمہ دانی'' بچہ بولا، اور پھر مسافر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نئے سوال کا انتظار کرنے لگا، معلوم ہوتا تھا اسے گٹھڑی میں بندھی ہوئی چیزوں کی ملکیت کا شدید احساس ہے۔

''میں لگالوں ذرا سا؟'' مسافر نے پوچھا۔

''ماں کا ہے'' وہ بولا۔۔۔۔اور پھر بقراط بن گیا ''دن کو نہیں لگاتے سرمہ جن عاشق ہو جاتا ہے۔''

''ارے!'' ہم ایک دم ہنس دیئے اور بچہ جھینپ گیا۔

''میں نے دن ہی کو لگایا تھا سرمہ ''فاطمہ بولی'' اور جاگیردار کے کھیت سے گھاس چرانے چلی گئی تھی۔'' فاطمہ اور مسافر یک بارگی اس زور سے ہنسے اور فاطمہ کے مذاق سے میں کچھ ایسا چکرا گیا کہ نہ ہنس سکا اور نہ جھینپ سکا، اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب انسان اور اُلو میں صرف چونچ کا فرق رہ جاتا ہے۔

خوب جی بھر کر ہنس لینے کے بعد مسافر نے اب کے چیتھڑوں سے بنی ایک گیند اٹھائی جس پر میں نے ریشم کے دھاگوں سے جالی کاڑھی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''کھیلو گے؟'' بچے نے گیند چھین کر مسافر سے پوچھا۔

''بکائنوں تلے گیند کھیلا جائے تو پریاں عاشق ہو جاتی ہیں'' مسافر بولا۔

اور ہم سب ہنس دیئے، مگر بچے نے اچانک ایک تتلی دیکھ لی تھی اور گیند کو زمین پر پھینک کر وہ بکائنوں تلے اس کے پیچھے ایک دائرے میں بھاگنے لگا، پھر تتلی باہر اڑ گئی تو وہ بھی باہر بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔

مسافر نے میری بنسری، میرے الغوزے، آئینے کا ایک ٹکڑا، سوئی دھاگے کی ننھی سی پٹاری، تیل کی شیشی جس کے ڈھانے پر ت مکئی کا نچا ہوا بھٹا پھنسا ہوا تھا، لکڑی کی کنگھی، چنے اور مونگ کی دال کی پوٹلیاں، غرض سب کچھ ایک ایک کر دیکھا اور پھر انہیں قرینے سے رکھ کر بولا۔ ''بس یہی کچھ ہے تمہاری پونجی؟''

''اور کیا ہوتی'' میں نے کہا۔

''کسان ہو نا؟''

''ہاں''

''بیل کہاں ہیں؟''

میں خاموش رہا، خاموش رہنا ہی اچھا تھا، ہر انسان دکھی ہے، اور دکھوں کو بانٹنا اچھا نہیں ہوتا اس نے مجھ سے مایوس ہو کر فاطمہ کی طرف دیکھا،

''بک گئے'' وہ بولی،

''کیوں؟'' مسافر نے پوچھا،

''رکارڈوں والا باجہ خریدنا تھا۔'' فاطمہ سنجیدگی سے بولی۔ ''پرجاگیردار نے کہا کہ یہ رقم اس کی زمین پر اگے ہوئے غلے کو ناجائز طور پر بیچ کر حصل کی گئی ہے، ہو ہی لے گیا۔''

''جن کا بچہ تو تھا کم بخت'' مسافر نے اپنی طرف سے سنجیدگی اور اُدسی کا خول توڑنا چاہا، اور ہنسا، مگر فوراً اپنی ہنسی کی تنہائی محسوس کر کے بکائنوں کے تنوں میں سے دور جھیل کو دیکھنے لگا۔

پھر جب مٹی کے دو پیالوں میں فاطمہ نے ہمیں چائے دی تو مسافر کے چہرے پر سختی سی آ گئی اور وہ جیسے بہت پریشان ہو کر بولا۔ ''بھئی آخر تم کون ہو اور تمہیں کہاں جانا ہے؟''

تتلی پھر بکائنوں کے جھنڈ میں گھس آئی تھی اس لئے بچہ بھی بھاگا بھاگا وہاں پہنچا اور ہمارے سامنے چائے کے پیالے دیکھ کر اپنی کٹوری کیلئے مچلنے لگا۔ وہ ہر روز اس کٹوری کے لئے مچلتا تھا اور بدقسمتی سے اسے ہم گٹھڑی میں رکھنا بھول گئے تھے۔ مسافر نے اسے دلاسہ دیا اور وہ چپ چاپ ایک سعادت مند شاگرد کی طرح مسافر کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت دھوپ سنہری ہو گئی تھی اور میدان میں اکا دکا درختوں کے سائے ان کے قدموں سے لمبے ہو گئے تھے۔ چڑیوں کا غول پھر سے بکائنوں کے جھنڈ پر اتر آیا تھا۔ اور خوب تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک عورت اور ایک مرد جا رہے تھے۔ عورت کے سر پر چرخہ تھا اور مرد نے گٹھڑ میں روئی کا ایک ڈھیر باندھ کر اسے پیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں خوب باتیں کرتے جا رہے تھے۔۔۔۔ پھر اچانک بکائنوں کی پھننگوں پر کسی نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا، تیز چھرر کی آواز پیدا ہوئی، چند پتے ہوا میں ڈبکیاں لگاتے ہمارے آس پاس آن گرے، چڑیاں بہت سی گیندوں کی طرح فضا میں بکھر گئیں۔ اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

مسافر جو اپنے سوال کے جواب کے انتظار میں ابھی پیالے کو لبوں تک نہیں لے جا سکا تھا۔

میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا اور میں نے اس کے دوسرے سوال کا جواب دیا۔ ''باز یا شکرا چڑیوں پر جھپٹتا ہے۔''

''اور شکرے پر کون جھپٹتا ہے؟'' مسافر نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''چڑیاں ایکا کر لیں تو اس پر جھپٹ سکتی ہیں۔'' فاطمہ نے جواب دیا۔ ''شکرا ذرا بڑی قسم کی چڑیا ہے نا۔۔۔۔ اور آخر چڑیا ہی ہے نا۔''

''چائے پیو بھئی۔'' میں نے کہا، بات خواہ مخواہ ایک ایسا رخ اختیار کر رہی تھی جب جبڑے بھنچ جاتے ہیں اور کنپٹیوں میں فتیلے سے جل اٹھتے ہیں۔

وہ چائے پینے لگا، لیکن کچھ اس طرح جیسے کہانی سوچ رہا ہے، پھر وہ بچے کو بھی اپنے ہی پیالے میں سے چائے پلانے لگا۔

''تمہیں کہاں جانا ہے؟'' مسافر اپنی ہٹ دھرمی پر بدستور قائم تھا۔''

فاطمہ میری طرف دیکھنے لگی، چڑیوں پر شکرے کے حملے کے بعد اس کی مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی جو اس کے لبوں کے گہرے گوشوں میں ہمیشہ دبکی رہتی تھی۔ وہ نہایت سختی سے بولی۔''بتاتے کیوں نہیں صاف صاف کیا تم چوری کر کے آ رہے ہو؟ کیا کوئی ڈاکہ ڈالا ہے تم نے؟ تم نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، خدا کو یہی منظور تھا، پھر تم اسے چھپاتے کیوں ہو؟ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جاگیرداروں نے تم سے زمین چھین لی ہے اور گاؤں سے نکال دیا ہے اور اب ہم۔۔۔۔۔اب ہم جانے کہاں جا رہے ہیں، تمہارے گھٹنے پر چیونٹا چڑھ گیا ہے۔ جھٹک دو اسے۔''

میں نے چیونٹے کو جھٹک دیا اور چائے پی کر اطمینان سے بولا۔''بات یہ ہے بھائی۔۔۔''

اور پھر میں سورج کی دیکھ کر چونکا۔''بات یہ ہے کہ دیر ہو رہی ہے ہمیں شام تک کسی آبادی میں پہنچ جانا چاہیے۔''

لیکن اس روز تو فاطمہ کی ضد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلی بار میں نے اس کی بھوؤں کے درمیان شکن دیکھی۔ وہ زور زور سے بولنے لگی۔''ارے کترا تے کیوں ہو؟ بتاتے کیوں نہیں؟ چار راتیں ویرانے میں گذار دیں اور آج آبادی تک پہنچنے کی دھن سوار ہے! وہاں آبادی میں ہمارا ابا بیٹھا ہے کہ پلنگ بچھا دے گا اور شربت گھول دے گا؟۔۔۔ پگلا۔''

اس نے کیتلی کو یوں جھٹکا دے کر اٹھایا کہ اس کی ٹونٹی سے گھونٹ بھر چائے گر گئی، پھر وہ خالی پیالہ بھر کر بولی۔''بات یہ ہے بھیا کہ ہم بہت دکھی ہیں، قصور یہ ہے ہمارا کہ ہم جاگیردار کے جن کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں ان کی پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ ہمیں ملتا ہے۔ اور اس کی ایک چوتھائی میں سے بھی کئی نذرانے پیش کرنے پڑتے ہیں، باپ دادا کے زمانے سے یہی دستور چلا آ رہا ہے۔ اس نے چند سر پھروں سے مل کر شور مچایا کہ ہم اب کی پیداوار کا آدھا حصہ لیں گے۔ اس نے اپنا حق مانگا تھا پر۔۔۔''اس کی آنکھیں اچانک چمک اٹھیں۔۔۔''شکرے پر جھپٹنے کے لئے سب چڑیوں کا ایکا بھی ضروری ہے اور یہ تھے کل چار پانچ سر پھرے، جاگیردار کے کان میں اس کی بھنک پڑی تو اسے پٹوایا بھی اور گاؤں سے بھی نکال دیا اس کے دو ساتھی زخموں سے چور قصبے کے ہسپتال میں پڑے ہیں اور ہم چار روز سے سفر کر رہے ہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔۔بس چلے جا رہے ہیں۔ بچہ چلتے چلتے ادھ موا ہو جاتا ہے تو ہم اسے اٹھا لیتے ہیں اور پھر خود ادھ موئے ہو جاتے ہیں، اس کو مار پڑی ہے کہ زخم نظر نہیں آتا پر دکھن ہڈیوں میں اتری ہوئی ہے۔ زور سے ہنسے تو پسلیاں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ سب عزیز رشتہ دار جاگیردار کے مزارع ہیں۔ ہم سے ہمدردی کرتے تو پٹتے بھی اور گاؤں سے بھی نکلتے۔ یہ کہتا ہے کہ خدا کی زمین تنگ نہیں۔ میں کہتی ہوں کہ جاگیردار کی زمین تو تنگ ہے نا۔ اور خدا کی ساری زمین آج جاگیردار کی زمین ہے۔ پھر ہم کہاں جا کر سر پھوڑیں گے؟ ہزار بار کہا کہ پلٹ چلیں، باپ دادا کا پسینہ جس زمین پر ٹپکا ہے اسی میں برکت ہے پر یہ ہے کہ بس ایک بزدلی سوار ہے اور۔۔۔۔۔''

''اے فاطمہ'' میں نے اسے شائد پہلی بار گھر کا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ دیں۔ مجھے جکڑ لیا۔ مجھے گزرے ہوئے زمانے کی طرف گھسیٹ لے گئی۔ اور میں نے مسافر کی پروا کئے بغیر اس کے بالوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے نہائت نرمی سے کہا۔ ''فاطمہ آگے میں بتاتا ہوں، تم چائے پی لو۔''

فاطمہ نے ایک ہی سانس میں پیالہ پی کر کیتلی چھلکائی اور پیالے کو پھر بھرنے لگی۔

میں نے فاطمہ ہی کی باتیں دہرادیں اور آخر میں کہا۔ ''جانتا ہوں کہ ان جھیلوں اور پہاڑوں سے پرے میرے لئے فاقوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں، پر سچی بات کہوں میں پلٹ کر گاؤں نہیں جاؤں گا۔ معافی مانگنے کو ذلت سمجھتا ہوں اور معافی نہ مانگوں تو اکیلا ہوں۔ میرے ساتھی ہسپتال سے بچ کر نکلے بھی تو نکمے ہوں گے بے چارے، ان کی ٹانگوں اور باہوں کے ٹوٹنے کی آواز خود میں نے سنی ہے۔ اور کسانوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ان ہسپتالوں میں نہیں جڑ سکتیں۔ گھوڑے سے گر کر جاگیردار کی کھوپڑی ٹوٹی تھی تو ہڈیوں کی کرچیاں تک جڑ گئیں تھیں۔ دولت کے معجزے ہیں۔''

مسافر تنکے توڑے جا رہا تھا اور چڑیوں نے پھر سے غل مچا دیا تھا۔ بچہ ایک اور تتلی کے تعاقب میں پگڈنڈی تک جا پہنچا تھا۔ فاطمہ پیالے دھو کر گٹھڑی میں باندھ رہی تھی۔ مسافر نے میری طرف نہائت آزردگی سے دیکھا اور بولا۔ ''آج کل میں جہاں بھی گیا ہوں پرانے مزارعوں کی بیٹیوں کی عصمتیں لٹی ہیں۔ تم لوگ اپنی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر میدان میں کود پڑے ہو، شیر بھی اپنے شکار پر سوچ کر جھپٹتا ہے اور پھر تم زمینداروں سے ہزار الجھو، پٹواری کی کھتونی تو ہمارے بس میں نہیں، وہاں قانون کا پہرہ ہے۔۔۔ لیکن یہ ایسی فکر کی بات بھی نہیں ہے۔ یہیں کہیں کسی دوسرے گاؤں میں تمہیں زمین مل جائے گی۔ ''زمینداروں کو نئے مزارعوں کی ضرورت ہے پرانوں کی جگہ۔''

'' شرم نہیں آتی؟'' فاطمہ چلا اُٹھی۔

مسافر تیورا سا گیا اور میرے جی میں آئی کہ گٹھڑی اٹھا کر فاطمہ کے سر پر دے ماروں، اس نے مسافر کو یوں ڈانٹا تھا جیسے وہ کوئی بچہ ہے، اور اسی کا بچہ ہے، پھر اس نے اسی پر اکتفانہ کی بلکہ بولتی چلی گئی۔ ''اچھی خاصی سمجھ بوجھ کی باتیں کرت رہے تھے تم، اور اب ایسی کمینی باتوں پر اتر آئے!''۔۔۔۔۔۔۔ میں غصے سے اٹھ ہوا مگر وہ بولے چلی گئی۔ ''میں تو خاک چاٹ لوں گی پر کسی مزارعے بھائی کا حق نہیں ہتھیاؤں گی، ہمیں بھی تو زمینداروں نے نکالا ہے، پھر ہم ایسے دکھی بنے پھرتے ہیں، اور قسمت کو کوس رہے ہیں اور رو رو دیتے ہیں، تو ہم ان کا خیال نہ کریں جن کے گھروندے جلے ہیں، جن کی بیویوں اور بیٹیوں۔۔۔۔۔۔'' فاطمہ کا گلا رندھ گیا، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اس لئے اس کے پپوٹوں کے آس پاس ابھرتی ہوئی نمی بھی سرخ تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ پھر وہ جیسے ان آنسوؤں کو پی کر بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ اسے جینا ہے تو عزت سے، تو انہی لٹے ہوئے مزارعوں کو جمع کر کے جاگیرداروں سے اپنا حق مانگے نہیں، بلکہ چھین لے، نوچ لے جھپٹ لے، اور اگر ایسا ہی دھن کا پکا

ہے،اورآسمان سے نئے نئے کھیتوں کے اترنے کا منتظر ہے تو پھر ناک کی سیدھ میں چلتا جائے، میں مرتے دم تک تو اس کا ساتھ دوں گی ،اس کے بعد کی خبر خدا جانے۔۔۔۔۔''اس نے گٹھڑی اپنے سر پر رکھ لی اور بولی۔''چلو چلیں۔''پھر اس نے دور پگڈنڈی پر حیران کھڑے ہوئے بچے کو پکارا۔''چراغ۔۔۔۔۔اے چراغ!''

مسافر کی ساری تلخی اس نام نے دھودی، فاطمہ کے تیوروں نے اس کا رنگ فق کر دیا تھا اور جیسے وہ ان ساری کہانیوں کو ایک دم کھو بیٹھا تھا جو اس نے ہم سے مل کر جمع کی تھیں،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مگر اب تو جیسے بچے کے نام میں اسے ایک اور کہانی مل گئی ۔۔۔۔۔''چراغ!''وہ حیران ہو کر بولا۔''بچے کا نام چراغ ہے؟''

مسافر کی اس معصوم حیرت نے فاطمہ کی تلخی کو بھی جھٹک دیا۔وہ ہنسنے لگی اور بولی۔''دیہاتی نام ہے بھائی، حیران کیوں ہوتے ہو؟''

''حیران کہاں ہو رہا ہوں'' مسافر بچے کو بکائنوں کے جھنڈ کی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔''میں تو خوش ہوا ہوں، بہت پیارا نام ہے، بڑا بامعنی ہے، نئی نسل کے بچوں کے نام ایسے ہی ہونے چاہئیں، خادم اور غلام قسم کے ناموں سے بزدلی اور کمتری پیدا ہوتی ہے، چراغ میں روشنی ہے اور گرمی ہے، اور خوبصورتی ہے،''چراغ بڑا پیارا نام ہے''اس نے اداس بچے کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا۔''اچھا تو تمہارا نام چراغ ہے؟''

بچہ جواب تک اپنے جذبات کو ہونٹوں کی کپکپی سے سنبھالے ہوئے تھا۔رو دیا۔''ایسی اچھی تتلی تھی، ایسے پیارے پیارے رنگ تھے۔سؤر کی بچی ایسی تیز اڑتی تھی، حرامزادی۔''

فاطمہ حسبِ معمول ہنسنے لگی،

میں نے چراغ کو تسلی دیتے ہوئے کہا''دیکھو تو جھیل تک سبزہ ہی سبزہ ہے، ہمیں راستے میں سیکڑوں تتلیاں ملیں گی۔''

مسافر بولا۔''میں یہ ساری تتلیاں چراغ کے لئے جمع کرلوں گا ایک پٹاری میں۔۔۔۔۔۔۔میں کہانیاں بھی چنتا ہوں اور تتلیاں بھی پکڑتا ہوں۔۔۔۔۔کتنی تتلیاں چاہئیں؟''

بچے نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھ لیتھے اور اپنی سرخ ناک کو مل رہا تھا۔

اور جب ہم بکائنوں کے اس جھنڈ سے نکلے تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنی مٹی کا کچا گھروندا چھوڑ رہا ہوں، اس وقت سورج نے جھیل کی سطح پر آگ لگادی تھی، مغرب کی طرف جھک جانے کی وجہ سے وہ اپنی ساری شعاعیں جھیل میں انڈیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اور جیسے دن اب صرف جھیل کی چمک ہی سے روشنی حاصل کر رہا تھا، میں سوچنے لگا، یہ مسافر کہاں کا رہنے والا ہے، اس کے ماں باپ بھائی بہن کہاں ہیں! اور کیا کہانیاں چننے سیاس کی بھوک مر جاتی ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ فاطمہ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، اور اس کے کانوں پر بالوں کے سیاہ گچھوں کو دھوپ نے سنہری کر دیا

تھا،اور چراغ دونوں ہاتھوں سے اس کے بالوں کو جکڑے ہوئے تھا،اور وہ اس سے کہہ رہا تھا۔''تم چراغ ہو،تم روشنی ہو،تم گرمی اور حُسن ہو سمجھے؟ وہ جھیل سے پرے،اس بھوری بھوری دھند سے بھی پرے،ان پہاڑوں سے بھی پرے ایک افق ہے،اسے مستقبل کہتے ہیں،اس مستقبل کو تمہاری روشنی اور تمہاری گرمی اور تمہارے حسن کی ضرورت ہے،وہ تمہاری راہ تک رہا ہے،سمجھے؟ سمجھے چراغ؟''

چراغ مسکرانے کی کوشش کررہا تھا۔

''وہاں ایسے گاؤں ہیں جہاں کھیتوں میں گیہوں کی بالیں موتیوں سے لدی رہتی ہیں''

''تو کیا لوگ وہاں موتی کھاتے ہیں بے چارے۔''فاطمہ نے پلٹ کر پوچھا اور گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر زور زور سے ہنسنے لگی،اور اس کی سنہری باہوں پر سے ڈھیلی آستینیں سرک اس کے کندھوں پر آ گریں،اور مجھے اس نے ایک دم ماضی کے پاتال میں دھکا دے دیا،جہاں وہ گوپھیا میں پتھر رکھ کر اسے گھماتی تھی تو اس کا سچے سونے کے سے رنگ کا بازو بجلی کی طرح لشکارے مارتا تھا۔اور جب وہ گوپھیا کا ایک سرا چھوڑ کر پتھر کو باجرے کے لمبے لمبے پودوں میں ڈبو دیتی تھی،اور رہزن چڑیاں دور دور بکھر جاتی تھیں تو وہ کہتی تھی۔''جی چاہتا ہے ہر چڑیا کو باجرے کا ایک سٹہ دے دوں اور ان سے کہوں کہ کم بختو ڈاکے نہ ڈالا کروں،شریف بنو،اور باجرے کے یہ سٹے جواب کے میری بانہوں کے برابر لمبے ہیں،کم از کم ایک مہینے کے لئے تو تمہیں کافی ہوں گے''۔۔۔۔۔۔۔۔اور میں شرارت سے کہتا تھا۔''چلو ٹھیک ہے،چڑیوں کو تو باجرے کا ایک ایک سٹہ دے دیا تم نے،پر بے چارے چڑے!''۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جاتی اور اس کی آنکھیں مارے ہنسی کے بھیگ جاتیں،وہ اپنے پیٹ اور پسلیوں کو دباتی اور ہنستی جاتی۔اس کا رنگ گلابی ہو جاتا اور پھر نیلا پڑنے لگتا اور وہ بڑی مشکل سے کہہ پاتی۔''اچھا وہ چڑے!وہ مسٹنڈے کم بخت،وہ تمہارے ہوتے سوتے!''

اس وقت بھی اس کا بازو مجھے ایک کوندا،ایک شمع۔ایک کرن معلوم ہوا،اور وہ چمکتی ہوئی جھیل کا ایک حصہ معلوم ہونے لگی،جیسے اس جلتی ہوئی جھیل میں سے ایک لہر چھلک کر پگڈنڈی پر آ گئی ہے اور اب واپس جھیل کی طرف بہی جا رہی ہے۔

وہ پھر بولی۔''میں تو چراغ کو اس نگری میں کبھی نہ بھیجوں جہاں گیہوں کی جگہ موتی چبانے کو ملیں۔''وہ پھر ہنسنے لگی۔

اور مسافر نے پلٹ کر میری طرف یوں دیکھا جیسے میری بیوی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے،اس سے ساری کہانیاں چھین لی ہیں،اس کی ساری تتلیاں مسل ڈالی ہیں،میں جواب میں مسکرا دیا تو اس نے گھبرا کر چراغ کو دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔''میرا مطلب تو یہ تھا کہ مستقبل میرا یا تمہارا نہیں،چراغ کا ہے،ہم تم تو وقت کے ریلے میں بہتے ہوئے تنکے ہیں،ہوا کے بہاؤ میں گھرے ہوئے کوئل کے نچے ہوئے پر ہیں،ہمیں اپنے آپ پر کچھ بھی اختیار نہیں،ہم تم سب بے بس ہیں،اب دیکھو،تمہیں جاگیردار نے ان کھیتوں سے نکال دیا ہے جن کی مینڈھوں سے اب تک تمہارے باپ دادا کے خون پسینے کی مہکار اٹھ رہی ہے،جہاں تمہارے گیت دفن ہیں اور تمہاری امیدوں کے پنجر بکھرے وئے ہیں،اور زمیندار کو تمہیں ان کھیتوں سے نکالنے کا حق اس لئے ہے کہ مغلوں کے زمانے

میں اس کسی بزرگ نے کسی شکاری شہزادے کی پیاس بجھادی ہوگی۔ یاانگریز کے زمانے میں اس نے گورنر کی آمد پر گلیوں میں شالباف بچھا کر دونوں طرف ادھ ننگے مزارعوں کو سلامی کے لئے سجایا ہوگا اور انعام پایا ہوگا، یا اتحاد پارٹی کے زمانے میں قوم سے بغاوت کی ہوگی اور بدلے میں یہ مربعے ملے ہوں گے، یا اب لیگ راج میں اس نے کسی لیڈر کی دعوت پر۔۔۔۔۔'' مسافر نے ٹھٹک کر ایک طرف دیکھا، چراغ کو کندھے پر سے اتار دیا، لپک کر ایک جھاڑی کے پاس گیا اور جھپٹ کر اس کی کونپلیں نوچ لیں، وہ بچوں کی طرح کودتا ہوا آیا اور چراغ کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''تتلیاں چراغ، تتلیاں! اکٹھی دو، سرخ اور سبز۔ مجھے تو یہ دو کہانیاں لگتی ہیں، دو شور، دو تصویریں،۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ لو!''

چراغ مارے خوشی کے پھول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر رنگ آ گیا تھا جیسے وہ روزانہ مکھن کھاتا ہیاور شہد پیتا ہے۔

اس وقت فاطمہ کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

''چلو چلیں'' مسافر نے چراغ کو کندھے پر بیٹھا کر مجھ سے کہا۔

''فاطمہ'' میں نے فاطمہ کو پکارا، مگر وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایا کئے کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

مسافر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ فاطمہ چلائی۔ ''دیکھو دیکھو۔''

ہم سب جھیل کی طرف دیکھنے لگے۔

فاطمہ چلاتی رہی۔ ''یہ دھمک سی کیسی ہے! یہ کس کی چاپ ہے!''

ہم نے دیکھا کہ جھیل کی سطح پر آگ کو گرد و غبار نے بجھا دیا تھا، اور سورج اس غبار میں تانبے کی پرانی تھالی کی طرح بے رونق اور بے نور تھا، یہ گرد و غبار بلند ہو رہا تھا اور قریب آ رہا تھا اور ساتھ ہی جیسے پگڈنڈی پھیل رہی تھی، دھرتی دھڑک رہی تھی اور غبار میں سے چھنتا ہوا دبا دبا شور واضح ہوتا جاتا تھا، اس غبار میں سے گیت پھوٹ رہے تھے، اور ان کی ڈوبتی ابھرتی گونج سے کم از کم میرے دماغ میں لہو ناچنے لگا تھا۔ میں فاطمہ کی طرف دیکھا، وہ جیسے بازو تول کر ان سے شہپروں کا کام لینے لگی۔ چراغ کی مٹھی ڈھیلی ہو گئی تھی، اور تتلیوں کے سرخ اور سبز پر مسافر کی قمیض کے کالروں میں اٹک گئے تھے، مسافر کا منہ کھلا تھا اور چہرہ فق تھا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جانے کون ہیں!'' میں نے جواب دیا۔

''مزارعے ہیں اور کون ہیں''۔ فاطمہ مشین کی طرح بولی۔

پھر اچانک وہ اس شدت سے چلائی کہ میں نے آج تک اس کی تیز و تند آواز نہیں سنی تھی، ''ہماری ہے۔'' وہ چلائی ۔۔۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے بعد وہ پھر اسی زور سے چلائی۔ ''ہماری ہے''۔۔۔۔۔۔۔ اور میں اس سے اس پاگل پن کی وجہ پوچھنے ہی

والا تھا کہ وہ ایک بار پھر گرجی۔ ''ہماری ہے۔''

گردوغبار میں سے بلند ہوتا ہوا شور بالکل واضح ہو گیا۔ ایک آواز آئی۔ ''زمین کس کی ہے؟۔''

اور میں فاطمہ سے مل کر چلایا۔ ''ہماری ہے۔''

اور فاطمہ گٹھڑی کو میری طرف پھینک کر پگڈنڈی پر دیوانوں کی طرح بھاگنے لگی۔ اور میں گٹھڑی کو مسافر کے پاس رکھ کر فاطمہ کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اور چراغ مچل کر مسافر کے کندھے پر سے اترا اور میرے پیچھے بھاگنے لگا۔ ''ہماری ہے۔'' وہ بھی ہمارے ساتھ چلایا۔

یہ ایک امڈتا ہوا ہجوم تھا، لوگوں کے ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اور درانتیاں اور کندھوں پر ہل تھے، ان کی آنکھوں میں آگ اور چہروں پر گلاب تھے، وہ جھیل میں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جیسے جھیل نے بے قرار ہو کر اپنی طپال لہروں کو سیلاب کی صورت میں دھرتی پر انڈیل دیا تھا اور یہ سیلاب جھیل کے سونے کو ساری دھرتی پر پھیلانے کے لئے امڈ پڑا تھا، سب سے آگے عورتیں تھیں، ان کے پیچھے نوجوان تھے، کہیں کہیں بوڑھے بھی نظر آجاتے تھے جو اپنی سفید ڈاڑھیوں کے باوجود جوانوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہے تھے، ان کے چہروں اور سینوں پر پسینے کے موتی تھے، اور ٹانگوں پر گرد جم رہی تھی، اور وہ اپنا حق مانگنے کے بجائے چھیننے نکلے تھے، دھرتی کو آباد کر کے خود اجڑے رہنا انہیں اب قبول نہ تھا، گیہوں کے موتیوں کے ڈھیر تخلیق کرنے کے بعد خود دھول پھانکنے سے وہ اب انکار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ایک نوجوان گرجتا تھا۔ ''زمین کس کی ہے؟''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سب مل کر اپنے ہل اور درانتیاں اور کھرپے اور کدالیں اوپر اٹھاتے تھے اور یک زبان ہو کر دھاڑتے تھے۔ ''ہماری ہے''۔۔۔۔ اور جیسے افق تا افق یہ آواز طرارے بھرتی ہوئی پھیل جاتی تھی، اور پھر دھرتی کی طنابیں کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اور جب فاطمہ اور میں اور چراغ اس ہجوم کے قریب پہنچے تو ان کے نعروں میں زیادہ جوش زیادہ تندی اور زیادہ حدت آ گئی، یہ نعرے ہی ہمارا تعارف تھے، کسانوں نے کسانوں کو پہچان لیا تھا، اور جب فاطمہ عورتوں کے ہجوم میں مل گئی اور میں چھلکتی ہوئی جھجھر کو پہلو میں دبائے نوجوانوں میں آ گیا، تو ایک گیت شروع ہو چکا تھا، پھر جب یہ گیت ختم ہوا تو ہم مسافر کے قریب سے گزر رہے تھے۔

وہ پگڈنڈی پر اسی جگہ کھڑا تھا، اس کا چہرہ فق تھا، اس کا منہ کھلا تھا، اس کی قمیض کے کالروں پر تتلیوں کے پر اسی طرح چمٹے ہوئے تھے، اس نے فاطمہ کی گٹھڑی کو ایک ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا اور جیسے غنودگی میں ہمارے نعروں کے جواب میں اس کے لب بھی ہلتے تھے، پھر جب ہم کافی دور نکل آئے اور مجھے بکائنوں کا جھنڈ بھی نظر آنے لگا تو میں نے پلٹ کر دیکھا، کہ مسافر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہجوم کے آخری حصے میں مل گیا ہے۔

اچانک مجھے چراغ کا خیال آیا، اس ہجوم کہیں اس کے کچلے جانے کے خیال نے مجھے حواس باختہ کر دیا اور میں لپک کر ہجوم سے باہر آ گیا۔

اور میں دیکھا کہ چراغ سب سے آگے، عورتوں سے بھی آگے، بالکل ایک سپاہی کے ٹھاٹ سے اکڑا اکڑ کر چل رہا ہے، اور نعرے کا جواب دیتے ہوئے اپنا بازو اٹھا کر ہوا میں پھیلا دیتا ہے، اور اگرچہ بے شمار تتلیاں اس کے آس پاس منڈلا رہی ہیں، لیکن وہ دھول پھانکتا ہوا بڑھا جا رہا ہے، اور اس قفلے کی رہنمائی کر رہا ہے جو ڈوبتے ہوئے سورج کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، اور اس سرمئی جھٹپٹے میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا جس کے آخری سرے پر نئی صبح کی چاندی اور نئے سورج کا سونا اور نئے چیت کے موتی تھے۔

فاطمہ نے شائد میری حواس باختگی کو بھانپ لیا تھا، اور جب میں ہجوم میں شامل ہونے لگا تو اس کی بے تحاشہ ہنسی کی آواز آئی، اس کی آواز میں ایک پراسرار چھنا کا تھا جیسے زنجیریں ٹوٹتی ہیں اور تلواریں ٹکراتی ہیں اور گھنٹیاں